© rasailojaraid.com

قاری مجیب الرحمٰن (لاہور)

خون آشام میلہ

بہار کے موسم میں جب نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں تو ہوا خوشگوار اور گلوں پہ نکھار آ جاتا ہے۔ فضا میں پرندے چہچہاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے مطرب نے کوئی طرب فزا راگ چھیڑ دیا ہو۔ جب گلوں سے رنگ مستی ٹپکتا ہے اور......

ہوا کرتی ہے شراب پیدا

تو دل کا موسم بھی بسنتی ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس طرب انگیز موسم میں ایک دن اور ایک رات کے لیے میرا دل طرح طرح کے وسوسوں اور گمانوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے کہ حسب دستور ہر برس:

شام آتی ہے ہمیشہ یہی لالی لے کر

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اجنبی ہوں۔ حالانکہ اسی شہر کے اسی محلے میں ''جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں''، بچپن، لڑکپن اور جوانی کی کئی منزلیں انہی گلیوں میں طے کی ہیں۔ ساتھ والے خواجہ صاحب، سامنے والے چودھری صاحب، نکڑ والے بٹ صاحب......سب سے میری صاحب سلامت ہے لیکن اس خون آشام، شام کو مجھے یوں لگتا ہے کہ ان سب سے میری یگانگی بیگانگی میں بدل گئی ہے۔

محلے میں اردگرد کے گھروں میں چھتوں پر برقی قمقموں کا انتظام ہو رہا ہے......ڈیک لگ رہے ہیں......رنگین پتنگیں خریدی جارہی ہیں......ڈور کا انتظام ہو رہا ہے۔ لیجیے یہ سورج غروب ہوا۔ ہر سو روشنیاں بکھرنے لگیں۔ فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے۔ گولیوں اور گولوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا گونج اٹھی ہے۔ ہوا میں لہراتی رنگین پتنگیں آنکھوں کو سرور دے رہی ہیں۔ فضا میں بکھرتے انڈین گانوں نے کانوں کو مسحور کر رکھا ہے:

وہ جنت نگاہ یہ فردوس گوش ہے

خواتین کی ایک بڑی تعداد جو کبھی چراغِ خانہ تھی' آج شمعِ محفل بن کر گلابی گالوں، سیاہ بالوں اور اپنے ہونٹوں کی لالی سے عید نظارہ کا ساماں کر رہی ہے:

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

یوں لگتا ہے جیسے ''تمام شہر پہ آسیب سا مسلط ہے'' میں ڈرتے ڈرتے گھر سے باہر قدم رکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی اجنبی محلے میں آنکلا ہوں......ہر طرف اجنبی چہرے، نامانوس مناظر، اجنبی دیس کے گانے اور اجنبی تہذیب وثقافت کے مظاہر......

ہر اک سمت سے چیخیں سنائی دیتی ہیں　　صدائے ہم نفس و آشنا نہیں آتی

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اردگرد کے سب لوگ کسی ''ٹائم ٹنل'' میں بیٹھ کر ایک نئی ثقافت، نئی تہذیب اور نئے کلچر میں رنگے گئے ہوں اور میں کہیں پیچھے رہ گیا ہوں۔ میں ڈر کے مارے اپنے آس پاس کے لوگوں سے نگاہیں چار نہیں کر رہا۔ مبادا کوئی پوچھ بیٹھے: تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، یہاں کیا کر رہے ہو؟ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ کوندتی بجلیاں، یہ دمکتے قمقمے میرے قلب کو جلانے لگتے ہیں۔ میں واپس گھر آ جاتا ہوں۔ میرے گھر کی چھت پر کوئی برقی قمقمہ نہیں ہے۔ یہاں کوئی نغمہ نہیں گونج رہا، کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رنگین پتنگ ہوا میں نہیں لہرا رہی ......ارد گرد رنگِ نشاط اور میرے بام و در پر سیاہی جھلک رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک قوم جشن عید منا رہی ہو۔ اور میں کسی دوسری قوم کا فرد، علیحدہ خطے کا باسی، منفرد تہذیب وثقافت کا حامل شخص اس جشن طرب میں شریک نہیں ہوں۔ مجھے یوں نظر آتا ہے کہ یہ لا الہٰ الا اللہ کی بنیاد پر حاصل کیے گئے پاکستان کا شہر لاہور نہیں بلکہ ہندوستان کا کوئی شہر ہے۔ جہاں ''سب رنگ'' قومیت کے علمبردار ''پیار پتنگ'' اڑا رہے ہیں:

تجھ سے مل کر اپنوں سے بیگانے ہوئے　　اب تو پہچانے نہیں جاتے ہیں پہچانے ہوئے

میرا دل غم سے بھر جاتا ہے، طبیعت ملول ہو جاتی ہے، میں اپنے آپ کو تسلی دیتا ہوں کہ یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔ کل سے یہ انڈین نغمے یوں نہیں گونجیں گے۔ شمع محفل پھر چراغِ خانہ بن جائے گی۔ پھر سے یکتائی اور یک رنگی پیدا ہو جائے گی۔ یہ فضا اور بام و در پھر سے ایک ہو جائیں گے۔ بس ایک ہی رات کی تو بات ہے لیکن نہیں! اگلا دن بھی تو ہے۔ چلو ایک دن اور سہی! اتنے میں اللہ کا منادی پکارتا ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر! میں بوجھل قدموں اور شکستہ دل کے ساتھ اللہ کے گھر حاضر ہو جاتا ہوں۔ ارد گرد سے فضا میں بکھرتے نغموں کی گونج خانۂ خدا میں بھی سنائی دے رہی ہے۔ میں دل ہی دل میں مصور و مفکر پاکستان اقبال سے کہتا ہوں ''یا حضرت! دیکھ رہے ہیں اپنی قوم کو' جواب آتا ہے:

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

پوچھتا ہوں ایسا کیوں ہے؟ جواب ملتا ہے:

غفلت ہے، سرمستی ہے، بے ہوشی ہے یہ

واقعی اس سے بڑھ کر غفلت اور کیا ہو گی کہ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے کہ ستر کے قریب ہمارے ہی بھائی غریب الوطنی میں کسمپرسی کی حالت میں زندہ جل کر راکھ ہو گئے۔ لیکن ہمارے پتھر دل موم نہ ہوئے۔ روحِ اقبال سے پھر استفسار کرتا ہوں، اس کا انجام کیا ہو گا؟ ارشاد ہوتا ہے۔ وہی:

شمشیر وسناں اوّل طاؤس ورباب آخر

جی ہاں آغاز وہ تھا' انجام یہ ہے! کیا عوام اور کیا حکمران سبھی اس انجام کی طرف یوں بڑھ رہے ہیں۔ جیسے بھوکے دسترخوان پر! اس قاتل بسنت کی آڑ میں حکمران اپنے روشن خیالی کے تاریک نظریے کی ترویج چاہتے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اپنے حلوے مانڈے (مال وزر) سے کام......اور عوام کالانعام کو ہلا گُلا چاہیے۔ بیچ میں کچھ گردنیں کٹتی ہیں تو کٹتی رہیں۔ ایک قافیہ سنج دوست کے بقول بسنت کی آڑ میں ملٹی نیشنل کمپنیاں مالا مال ہوتی ہیں۔ عوام ''حال کھیلتے ہیں۔ اور حکمران روشن خیال کہلاتے ہیں۔ بیچ میں کچھ جرم ضعیفی کے مارے اپنے بچوں کی گردنیں کٹوا کر تباہ حال کہلاتے ہیں اور شیاطین انس وجن اپنا جال پھینکتے ہیں اور روشن خیالی ایک اور قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔

روشن خیالی کی ترویج کا یہ طریقہ تو سولہویں صدی کے روشن خیال اور ''ملٹی نیشنز'' کے علمبردار اکبر اور اس کے مشیر ابوالفضل اور فیضی کو بھی نہ سوجھا ہو گا۔ فیضی جیسی عبقری شخصیت آج زندہ ہوتی تو اپنے ان ''ہم خیالوں'' کے سامنے یہ ماننے پر مجبور ہوتی:

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ ہم خواہ مخواہ راسخ العقیدہ علماء سے ٹکر لے کر بدنام ہوئے۔ روشن خیالی اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھیل ہم بھی کھیلتے اور مل کر بھجن گاتے:

اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں

ذرا سوچیے! سپریم کورٹ کے فیصلے کے باوجود حکومتی سرپرستی میں پتنگ بازی کی اجازت! آخر کس بات کی غمازی کر رہی ہے۔ اور ستر کے قریب پاکستانی مسلمانوں کے زندہ جل جانے کے باوجود بھی اگر ہم بھارتی گانوں کی گونج میں ’’پیار پتنگ‘‘ اڑانے پر بضد ہیں تو اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ ہمارے دل پتھر ہو چکے ہیں:

جتنے معمار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں　　جتنے افکار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں

کبھی وہ دن تھے کہ مسلمانوں کو کانٹا کابل میں چبھتا تھا اور ہندوستان کا ہر پیر و جواں بے تاب ہو جاتا تھا۔ ہندوستان کا مسلمان بھی کوئی سکھی نہیں تھا...... وہ خود اپنے ہی دیس میں گوناں گوں مصائب میں پھنسا ہوا تھا...... لیکن اس کے باوجود وہ سب سے پہلے ہندوستان کا نعرہ بلند کرنے کی بجائے جہاں کہیں اور جس جگہ بھی کسی مسلمان کو بے قرار دیکھتا تو اپنی تکالیف و مصائب کو بھول کر اس کے دکھ درد میں شریک ہو جاتا۔ تحریک خلافت جیسی عظیم تحریک کے دوران ہندوستانی مسلمانوں نے ایثار و قربانی کی جولا زوال داستانیں ثبت کی ہیں، وہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہیں...... جب مولانا محمد علی جوہر کا ’’کامریڈ‘‘ اور ’’ہمدرد‘‘، مولانا ابوالکلام آزاد کا ’’الہلال‘‘ اور مولانا ظفر علی خاں کا ’’زمیندار‘‘ ہندوستان کے باہر کے مسلمانوں کے لیے حکومت وقت کے خلاف شعلے اگل رہا تھا۔ جب اقبال تہذیبِ حجازی کا مرثیہ لکھ رہا تھا:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار　　وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

لیکن آج ’’سب سے پہلے پاکستان‘‘ کی سوچ کو پروان چڑھانے والے روشن خیالوں سے کوئی پوچھے کہ افغانستان، عراق اور فلسطین میں شہید ہونے والے تو ’’باہر‘‘ کے لوگ ہیں لیکن بسنت نائٹ کے موقع پر اندھی فائرنگ کا شکار ہونے والے عبدالرحمٰن، مریم اور حیدر علی جیسی معصوم کلیوں کا تعلق کس چمن سے تھا؟ ہو سکتا ہے سات سالہ مریم سے یہ پوچھا گیا ہو کہ ’’بِای ذنب قتلت تمہیں کس گناہ میں قتل کیا گیا؟ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے جواب میں خون آشام کھیل میں شریک لوگوں پر فردِ جرم عائد کر دی جائے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان مرجھانے والی کچی کلیوں کے والدین کی آہ و بکا سے کسی بڑی مصیبت، کسی بڑے عذاب کا فیصلہ ہو جائے:

نہ جا اُس کے تحمل پہ کہ بے ڈھب ہے گرفت اُس کی　　ڈر اُس کی سخت گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

ڈرو اُس عذاب سے کہ جب آتا ہے تو آٹے کے ساتھ گھن کو بھی پیس دیا جاتا ہے۔ پھر لاشوں پر رونے والا کوئی نہیں ہوتا...... جب آبادیاں ویرانوں میں بدل جاتی ہیں...... جب مردے دفنانے کے لیے لوگ میسر نہیں آتے۔ جب اجتماعی قبریں بنتی ہیں۔ جب انسانی لاشوں پر کوے اور گدھ منڈلا رہے ہوتے ہیں۔ ابھی وقت ہے، ابھی درِ توبہ کھلا ہے! کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر مہلت عمل ختم ہو جائے۔ اُس وقت سے پہلے پہلے جو زبانوں سے روکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی زبانوں کو حرکت میں لائیں اور جن کے ہاتھوں میں دم ہے وہ اپنا ہنر آزمائیں: فھل منکم من مبارز پس ہے کوئی تم میں احتجاج کرنے والا ہے کوئی ان کچی کلیوں پر رونے والا جو بن کھلے مرجھا گئیں۔ ہے کوئی ایسا جو اِن کی موت کا نوحہ لکھے! ایسا نوحہ جو دیدۂ عبرت کو وا کر دے، جو کانوں کو گوشِ نصیحت نیوش کر دے!

☆☆☆

© rasailojaraid.com